وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعاً فَاسْأَلُوهُنَّ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ (الاحزاب:۵۳)

اور جب تم ان (امہات المومنین) سے کوئی سامان مانگو تو پردے کے پیچھے سے مانگو۔

يَآ أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ (الاحزاب:۵۹)

اے نبی! آپ اپنی بیویوں سے اور اپنی بیٹیوں سے اور مومنوں کی عورتوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی چادروں کا ایک حصہ اپنے اوپر لٹکا لیا کریں۔

اسی لیے مریم جمیلہ نے عورتوں کے گھر کے اندر رہنے ہی کو بہتر سمجھا ہے اور اس بات کی یاد دہانی کرائی ہے کہ معاش کی ذمہ داری شوہر یا گھر کے مرد سرپرست کی ہے۔

مریم جمیلہ نے نہ صرف عورتوں کو شریعت کے اصولوں پر عمل کرنے کی ترغیب دی، بلکہ خود بھی ان پر عمل کر کے دکھایا۔ چنانچہ انھوں نے قرآن کریم کی اس تعلیم پر عمل کرتے ہوئے کبھی معاش کی فکر نہیں کی، کیوں کہ ان کے شوہر ان کے لیے ذریعۂ زندگی مہیا کرنے کے لیے موجود تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اپنی ساری توجہ کتابیں تصنیف کرنے میں صرف کی، جس کی وجہ سے دنیا کو بیش قیمتی علمی و فکری سرمایہ مل گیا۔

مریم جمیلہ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ عورت تبھی صحیح معنوں میں بہتر ہوگی جب وہ ایک اچھی ماں اور اچھی بیوی بن کر رہے۔ اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو قرآن و سنت کی تعلیم دے۔ ایک ماں اپنے بچوں کے لیے اعلیٰ نمونہ بن کر ان کی زندگی پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ مریم جمیلہ نے اس بات پر زور دیا کہ ماں اپنے بچوں کو بچپن سے ہی اسلامی آداب سکھائے اور اس کی پرورش اسلامی نہج پر کرے۔ یہی چیز عورت کی کام یابی کی ضامن ہے اور یہی اس کی ذمہ داری بھی ہے۔ ۱۵

مریم جمیلہ نے اپنی تحریروں کے ذریعہ ان تمام اعتراضات و اشکالات کو دور کر دیا جو عورتوں کے مقام کی آڑ میں اسلام کے خلاف پیش کیے جاتے تھے۔ انھوں نے خود اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ اسلام عورت کو دبا کر نہیں رکھتا، بلکہ اسے اس بات کی آزادی دیتا ہے کہ وہ سکون و عافیت کے ساتھ زندگی گزارے۔ اسلام نے مرد کو عورت کا

نگہبان بنادیا، تاکہ اسے کسی قسم کا ڈر نہ رہے اور وہ کبھی خود کو کم زور محسوس نہ کرے۔ مریم جمیلہ نے اسلامی تعلیمات کو جس طرح سمجھا اسی طرح انھیں اپنی زندگی میں شامل کیا اور تمام عورتوں کو بھی ان پر گام زن رہنے کی تلقین کی۔

حواشی ومراجع

1- Maryam Jameela, Quest for the Truth:Memories of the Childhood and youth in America (1945-1962), Afaqi Book Depot, Delhi-6, p.19

2- Maryam Jameela, Why I Embraced Islam. Taj Company Delhi, 1982, p.3

3- Maryam Jameela, Why I Embraced Islam. p.3

۴- مریم جمیلہ اور مولانا مودودی کی مراسلت، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی-۲۵، ۲۰۱۰ء، ص:۴-۳

5- hllp://be la.Jasaral.com/magazlne/Jasaralmagazlne/news/36424-10-2-2013

6- The Convert: A tale of Exile and Extremism. penguin viking, Dipura Bader, p.18

7- http://beta.jasarat.com/magazine/fri/news/14016-10-2-2013

8- Islam and Muslim Woman Today, p.29

9- Islam and Muslim Woman Today, p.41

10- Women in the Modern World, p.77

11- Women in the Modern World, pp.122-123,

12- Islam and Muslim Woman Today, p.42

13- Islam and Muslim Woman Today, p.28

۱۴- اسلام ایک نظریہ ایک تحریک، ص:۱۲۶

15- Islam and Muslim Woman Today, pp.10-11

☆☆☆

کلامِ اقبال میں تصورِ معیشت

ڈاکٹر علی محمد

معاشیات کا علم مادی ضروریات اور ان کی تکمیل کے ہر پہلو کو اُجاگر کرتا ہے۔ معاشیات نے دورِ حاضر میں انسان کے ہر پہلو کو متاثر کیا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کا حقیقی مقصد ہی معاشیات میں مضمر ہے۔اسلامی سماج میں معیشت اگرچہ بذاتِ خود مقصد نہیں ہے، مگر مقصد تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ اسلامی سماج کے اہداف میں سے ایک ہدف ہے، جو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ عصرِ حاضر میں معیشت ہی ایسا محور قرار پایا ہے جس کے اِردگرد انفرادی اور اجتماعی زندگی گردش کرتی ہے۔ پندرہویں صدی عیسوی کے وسط کی عام بیداری کے بعد رونما ہونے والے صنعتی انقلاب نے ساری معنوی و اخلاقی قدروں کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے۔لوگوں نے نئی نئی اقتصادی قدریں ڈھونڈھ نکالی ہیں۔اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ مسیحیت کے علم برداروں نے مذہبی قدروں کو من مانے طرز پر اپنانے کی ٹھان لی۔مسیحیت حکم راں اور مال دار طبقوں کی آلۂ کار بن گئی۔ سیاسی حالات میں اپنے آپ کو ڈھالنے کے لیے انھوں نے کم زوروں کو طاقت وروں اور غریبوں کو امیروں کا غلام بنانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔اس طرح وہ دنیاوی آسائش سمیٹنے کے کام میں جُٹ گئے۔[۱] ایسے حالات نے لوگوں کے اندر مذہب کے خلاف نفرت پیدا کی اور ردِعمل کے طور پر فکری انقلاب رونما ہوا۔ ان نئے افکار و خیالات سے وہ دینی عقائد اور تصورات کے خلاف بغاوت کا درس دینے لگے۔ اس معاملے میں کارل مارکس، الفرڈ مارشل ،سیلوہ جیزیل اور جوزف شوبیٹر کے علاوہ اور بھی یورپی آزاد خیال دانش ور ہم آواز ہوئے۔ اُن کا کہنا ہے کہ

دولت کا اطلاق ان تمام چیزوں پر ہوتا ہے جو کسی معاشی منفعت کے حصول کا ذریعہ بنیں اور معاشی فائدے کی تعریف یہ قرار پائی کہ انسانی خواہش اور دِلی تسکین جن چیزوں سے پوری ہو جائے اور جن کی مادی حیثیت سے کوئی فائدہ ہو، وہی پاک اور حلال چیزیں ہیں ۲۔ مثال کے طور پر شراب اُن کے درمیان حلال اور جائز ہے اس لیے کہ اس سے انسان کی اندرونی خواہشات کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ عورتوں کی نمائش بھی تجارت میں زیادہ نفع بخش چیز قرار پائی، کیوں کہ اُس سے کشش پیدا ہوجاتی ہے۔ اس طرح اچھے اور بُرے کا معیار منفعت کا وجود اور عدم وجود قرار پایا۔ ۳۔ علمی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو دورِ جدید کے بعض ماہرینِ معاشیات کے نزدیک منفعت دراصل وہ ہے جو سماج اور معاشرے کے لیے سودمند ہو، اگر چہ عملی زندگی میں اس نظریہ کا اطلاق عمل میں نہیں آسکے۔ مارکس فکری انقلاب کے بعد معاشی فراوانی اور معاشی خوش حالی کو کام یابی کا معیار قرار دیتا ہے۔ اس نظریہ کو مدِ نظر رکھ کر مختلف یورپی اسکالرس نے معیشت کی تعریف کی ہے۔ اس میں خاص کر مارشل نے اپنی کتاب 'معاشیات کے اصول' میں جو تعریف کی ہے، شاید ہی اس سے بہتر تعریف کوئی کر سکے۔ وہ رقم طراز ہے:

> ''سیاسی معیشت یا علم معاشیات انسانی زندگی کے روزمرّہ کے معمولات کے مطالعہ کا نام ہے۔ یہ فرد اور جماعت کے ان کاموں سے بحث کرتا ہے جن کا تعلق مادی فلاح و بہبود کی خاطر مادی ضروریات کے حصول اور ان کے طریقۂ استعمال سے ہے''۴۔

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

> ''دنیا میں انسانی زندگی پر دو اہم امور اثر انداز ہوتے ہیں: ایک تو اس کے معاشی معاملات وحالات اور دوسرا اس کا مذہبی عقیدہ۔ لیکن ان دونوں میں موازنہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسان مذہبی عقیدے کے مقابلے میں اپنے معاشی حالات سے زیادہ متاثر ہوتا ہے، کیوں کہ انسانی اخلاق و عادات پر روزمرّہ کے معمولات اور مادّی منفعت کے حصول سے گہرا اثر پڑتا ہے''۔ ۵۔

عصرِ حاضر میں معاشی انقلاب سے انسانی قدریں یک سر بدل گئیں۔ اس وقت انسان ایک دوسرے کو ڈالر کے پیمانے سے ناپنے لگا اور سماج کا طریقہ ہی یہ بن گیا کہ سماج میں بہترین اور اہم وہ انسان ہے جو سب سے زیادہ مال دار ہے، بلکہ افلاطون کے الفاظ میں فضلیت کا معیار ''معرفتِ الٰہی کے بجائے معاشی خوش حالی'' بن گئی۔ اس وقت جو اعلیٰ قدریں جاری و ساری ہیں وہ مکمل طور معاشی قدروں کے گرد گھومتی ہیں۔ مادی زندگی کے لیے انسان ہر اُس راستے پر چلنے کو تیار ہے جس سے یہ رتبہ حاصل ہو۔ اس کے برعکس وہ راستے فطرتِ سلیم اور صحیح عقائد سے ہم آہنگ ہیں، بلکہ ایک عظیم ماہرِ معاشیات سیلوہ جیزیل، جو اپنے طرزِ فکر میں کما حقہ بے حد معتدل اور اسلام سے قریب تر ہے، وہ اپنی کتاب 'فطری نظامِ معیشت' کے مقدمہ میں لکھتا ہے:

> ''جب کسی شخص کے اعمال اس کے دینی خیالات سے متصادم ہوں، حقیقتاً وہ روشن ضمیر ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے اِن خیالات پر نظر ثانی کرے، کیوں کہ ایک خراب درخت بہترین پھل نہیں دے سکتا۔ اس بنا پر ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس انجامِ بد سے بچنے کی کوشش کریں جس سے ایک مسیحی غربت اور فقر و فاقہ کی شکل میں دوچار ہوتا ہے اور جو اسے عقائد پر عمل کرنے کی وجہ سے معاشی قوتوں اور محرکات سے نپٹنے کی صلاحیت سے محروم کر دیتا ہے''۔۶؎

اٹھارویں اور اُنیسویں صدی میں معیشت کے بارے میں مخصوص نظریات رائج تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب معاشیات کو ابھی علیٰحدہ مضمون کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اُس وقت معاشیات کو معیشت کہا جاتا تھا۔ معیشت کو منڈیاں چلاتی تھیں اور سمجھا جاتا تھا کہ ہر چیز کی ایک قدر یا قیمت ہے، جس کی وجہ سے معیشت چلتی ہے اور صرف پیداوار طلب و رسد سے جنم لیتی ہے۔ ۷؎

صنعتی انقلاب کے نتیجے میں اشیاء کی پیداوار نمایاں حد تک بڑھ چکی تھی۔ اس کے لیے منڈیاں درکار تھیں۔ اس بڑھوتری کی وجہ سے مغربی ملکوں میں کش مکش جاری

ہوئی، جس نے بعد میں نو آبادیاتی نظام کی شکل اختیار کر لی۔ صنعتی انقلاب میں سرمایہ دار طبقہ کو سیاست اور معیشت دونوں میں بالاتر پوزیشن حاصل ہوگئی تھی۔صنعت وحرفت کے تناظر میں یہ دور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ مسلم اصلاح کاروں نے اس کا بڑی باریک بینی سے مشاہدہ کیا اور اس کے تدارک کی تدبیریں کیں۔ اسی مقصد سے علامہ اقبال نے اپنی کتاب 'علم الاقتصاد' قلم بند کی۔ یہ کتاب اُس دور میں لکھی گئی جب کلاسیکل دور زوال پذیر تھا اور جدیدیت نے اپنے پنجے گاڑ دیے تھے۔ اس وجہ سے اس کتاب پر کلاسیکل نظریات کی بہت گہری چھاپ دِکھائی دیتی ہے۔

برصغیر کے تناظر میں یہ عہد بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ خصوصاً ۱۹۲۰ء کے بعد جب تجارت، صنعت وحرفت اور حکومتی اداروں پر ہندوؤں نے غلبہ حاصل کر لیا تھا اور مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ بات اُجاگر ہوگئی تھی کہ اُن کا بہ حیثیت قوم متحد ہونا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس کے لیے ان کے اندر معاشی قومیت کا احساس پیدا ہونا شروع ہوا اور بہ یک وقت مختلف سمتوں سے کوششیں شروع ہوئی۔۸؎ اس معاملے میں علامہ اقبال ایک کثیر الجہات شخصیت کی حیثیت سے سامنے آئے۔ انھوں نے معاشی مسائل اور نظریات پر گہری اور ناقدانہ نظر سے تحقیق شروع کی۔۹؎

اقبال نے اپنی کتاب 'علم الاقتصاد' کو زیادہ اہمیت نہیں دی، مگر انہوں نے اپنی نظم ونثر دونوں میں مختلف معاشی حوالوں سے اظہار خیال کیا ہے۔اُن میں بعض خیالات شاہ ولی اللہؒ کی معاشی فکر سے جاملتے ہیں اور تعلیمی نظریات سر سید کے فکر کے حامل تھے، بلکہ یوں کہیے کہ انھوں نے اس کی ایک مزید نکھری ہوئی شکل ترتیب دی۔ اصل میں علامہ جن معاشی موضوعات کو زیر بحث لائے ہیں وہ بڑی اہمیت کے حامل تھے۔انہوں نے ہندوستانی مسلم کی ابتر حالت کے لیے چار بنیادی عوامل کو ذمہ دار ٹھہرایا: (۱) مسئلہ غربت (۲) تصور فقر (۳) مسئلہ ملکیتِ زمین (۴) سرمایہ داری یا اشتراکیت۔ علامہ اقبال نے غربت کی، بالخصوص مسلمانانِ ہند کی معاشی بدحالی کو مدنظر رکھ کر اُس کی وجہ اور حل تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ہندوستان میں پھیلی غربت اقبال کے معاشی فکر کا سب سے اہم پہلو رہا ہے۔ یوں تو غربت

ہندوستان کی عام پہچان ہے اور مسلمانوں کی عمومی اقتصادی حالت بہت ہی زیادہ ناگفتہ بہ ہے۔ عام غریب مسلمان بہت قلیل اُجرت پر کام کے لیے تیار ہوجاتے تھے، مگر کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے تھے۔ ۱۰؎ مسلمانوں کی اقتصادی بدحالی کے کیا اسباب ہیں؟ اس کے پیچھے بین الاقوامی اقتصادی قوتوں کا کتنا ہاتھ ہے؟ اور کس حد تک اہل ملک کی اپنی کم زوریاں ذمہ دار ہیں؟ ان تمام امور پر گہرے غور وخوض کرنے کے بعد علامہ اقبال نے اُن کا حل بھی بتا دیا۔ ۱۱؎ اقتصادی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے مسلمانوں کے اندر رائج معاشی تفاوت کو ختم کرنا ضروری تھا۔ ۱۲؎ اگر چہ اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لیے سرکاری ملازمتوں میں مسلمان کے تناسب میں اضافہ بھی ضروری ہے ۱۳؎ لیکن اجتماعی خوش حالی اُسی وقت ممکن ہے جب انھیں اقتصادی آزادی نصیب ہو۔ ۱۴؎ اقتصادی بدحالی کا واحد علاج تعلیم کا فروغ ہے۔ اس نئی صورتِ حال میں اقبال نے اپنے ہم وطنوں کے لیے ایک نئی راہ تجویز کی ہے، جو ایک نئے بلکہ ڈارون کے بقائے اصلح کے تصور سے ملتی جُلتی ہے۔ ۱۵؎

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے تعلیم کا فروغ انتہائی ناگزیر ہے۔ علامہ اقبال کا ماننا ہے کہ معاشی بد حالی کی وجہ تعلیم کی کمی ہے۔ تعلیم اور اقتصادی ترقی لازم وملزوم چیزیں ہیں ۱۶؎ اس لیے اصل غربت جدید صنعتی اثاثوں کی نہیں، بلکہ ذہنی قوتوں کی قلت ہے۔ تعلیم، تجربہ، تکنیکی مہارت، دلائل اور مشاہدات کا استعمال اور فرائض کو ٹھیک طرح انجام تک پہنچانے کا جذبہ ایسے عوامل ہیں جو بغیر کسی خارجی سہارے کے معاشرے کو خود بہ خود سیدھی راہ پر لے جاتے ہیں۔ تعلیم سے جدو جہد کی کارکردگی اور استعدادِ کار بہتر ہوتی ہے اور نئی ایجادات واختراعات کی راہ کھلتی ہے۔ اس کے ذریعہ سے قدرتی وسائل سے بھر پور استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ وسائل کی موجودگی بے معنی ہو جاتی ہے اگر اُن سے فائدہ اُٹھانے کے لیے تکنیکی مہارت اور اعلیٰ تجربہ کار موجود نہ ہوں۔ ۱۷؎ اقبال کی نظر میں تعلیم کے ساتھ صنعت و حرفت کی یکساں ترقی بھی ضروری ہے۔ اس کے برعکس ترقی اور خود انحصاری ناممکن ہے۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ صنعت وحرفت ہی معاشی ترقی کو مضبوط اور معنیٰ خیز بناتی ہے ۱۸؎ معاشی آزادی پر زور دینے کی وجہ یہ تھی کہ علامہ اقبال کے نظریے میں اقتصادی اور صنعتی

ترقی ہی دراصل سیاسی آزادی کی راہ فراہم کرسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے بالخصوص انھوں نے تجویز پیش کی کہ انہیں ادب اور فلسفے کے ساتھ تکنیکی علم سیکھنا انتہائی ناگزیر ہے۔

بدست ادا گردادی ہنررا ید بیضا است اند راستینش ۱۹۔

معاشی ترقی محض سرمایہ میں اضافے کا نام نہیں ہے اور نہ محض جزوی تبدیلیوں کا نام ہے، بلکہ حقیقت پسندانہ اور انقلابی تبدیلیاں ہی معیشت کی ضرورت پوری کرسکیں گی۔ ۲۰۔ اس حوالے سے اسلام کا کردار خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اقبال کو اس بات پر سوفی صد یقین تھا کہ اسلام ہی دنیا کے کسی بھی طبقے کو بدل سکتا ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے کہا: ''تم اپنے اندر جو اعتقادات رکھتے ہو وہ فرد کی اہمیت کے قائل ہیں۔ اس کے برعکس انسان اس بات کے لیے کوشش کرے کہ انسانیت کی خدمت کرسکے۔ اس لیے مسلمان جس تقدیر کی بات کرتا ہے اس کے امکانات ابھی پوری طرح وجود میں نہیں آئے۔ وہ اب بھی ایک نئی دنیا پیدا کرسکتا ہے جہاں ذات، رنگ یا دولت کے پیمانے سے اس کی عظمت کو ناپا نہیں جاتا، بلکہ اس طرزِ زندگی سے، جہاں غریب و امیر پر ٹیکس اُس کے معیار کے مطابق لگاتے ہیں، جہاں انسانی سوسائٹی شکم کی مساوات پر نہیں، بلکہ روح کی مساوات پر قائم ہے''۔ ۲۱۔

اقبال نے برصغیر کے مسلمانوں میں جس اقتصادی جدوجہد کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی وہ روایتی اقتصادی تصور کو منہدم کر دیتی ہے۔ کیوں کہ اُس کو تقدیر کا نوشتہ سمجھا جاتا تھا۔ اصل میں کاہلی کو تقدیر سمجھ کر مسلمانانِ ہند نے فقر و افلاس کو مقدر مان رکھا تھا۔ اس لیے اقبال نے تقدیر کے جداگانہ تصور کی مدد سے یہ پیغام دیا کہ ''ہم زمانے کی حرکات کا تصور ایک پہلے سے کھنچے ہوئے خط کی شکل میں نہیں کریں گے، کیوں کہ یہ خط ابھی کھینچا جارہا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ امکانات جو ہوسکتے ہیں، وقوع میں آئیں یا نہ آئیں۔ ۲۲۔ اس تقدیری نظریہ کو اقبال اشعار کے طرز پر بیان کرکے اس انداز سے وضاحت کرتے ہیں کہ دنیا میں کوئی چیز طے شدہ نہیں ہے، جس کو تبدیل نہ کیا جاسکتا ہو۔

گرز یک تقدیر خوں گردد جگر　　خواہ از حق حکم تقدیر دِگر
تو اگر تقدیر نو خواہی رواست　　زانکہ تقدیراتِ حق لاتنہا است ۲۳؎

اگر انسان کے اندر حوصلہ اور جذبۂ جدوجہد زندہ ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو کہیں بھی پا سکتا ہے۔ وہ جمود کا شکار نہیں ہوسکتا، وہ لاتعداد تقدیرات اور حکمتِ خداوندی سے جو چاہے طلب کرسکتا ہے ؎

تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ　　خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تیری جبیں
جرأت ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے　　اے مردِ خدا ملکِ خدا تنگ نہیں ہے ۲۴؎

اسلام کے معاشی نظام کے مثبت مقاصد میں غربت کا انسداد اور تمام انسانوں کو معاشی جدوجہد کے مساوی مواقع فراہم کرنا ہے۔ اسلام سب کے لیے حصولِ رزق کے مواقع فراہم کرتا ہے اور مثبت طور پر ایسی حکمتِ عملی بنانے کی تاکید کرتا ہے، جس سے غربت و افلاس ختم ہو اور انسان کی بنیادی ضروریات لازماً حاصل ہوں۔ اسلام محض افلاس، غربت، معیار زندگی کے گرنے کے خطرات اور قلتِ وسائل کے طریقے اپنانے والی پالیسی کی اجازت نہیں دیتا، بلکہ حالات کو بدلنے کے لیے یہ شرط بنیادی اہمیت کی حامل ہے کہ انسان کو مسئلہ غُربت ختم کرنے کے لیے اپنی ذہنی سستی و کاہلی کو بدلنا از حد ضروری ہے۔ اسی لیے اقبال کو پختہ یقین تھا کہ انسان اگر خود بدل گیا تو وہ اپنی دنیا تبدیل کرسکتا ہے ؎

رمز باریکش بحرِ مضمر است　　تو اگر دیگر شوی او دیگر است ۲۵؎

دوسرا اہم پہلو، جو برصغیر کے مسلمانوں کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھا رہا تھا، وہ معاشی تنگ دستی اور پریشان حالی ہے، جس کو تصورِ فقر کہا جاتا ہے۔ اقبال کے ذہن میں فقر اور استغناء ہم معنی الفاظ ہیں۔ وہ اس استغناء کو بے رغبتی کہتے تھے جو ارادی ہے، اضطراری نہیں ۲۶؎ اقبال کے تصورِ فقر کے علم بردار سوشلسٹ اور مادہ پرست لوگ نہیں، کیوں کہ وہ اصلیت سے ہٹ کر دنیا پرستی کے متلاشی ہیں، بلکہ اس کے علم بردار وہ لوگ ہیں جو حُبُ اللہ کے متلاشی ہیں۔ وہ دنیا میں روزگار کو زندگی کا اصلی مقصد نہیں، بلکہ اس تک پہنچنے کا ایک ذریعہ مانتے ہیں، کیوں کہ یہی چیز سکونِ قلب اُجاگر کرتی ہے، جو سر

مایہ دارانہ نظام میں ناپید ہے۔ اس کے علاوہ سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت دونوں اخلاقی احساس سے محروم ہیں۔ اخلاقی اقدار کی عدم موجودگی میں اعلیٰ مقاصد نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور پست مقاصد کے حصول، بالخصوص مال اور دولت کے لالچ و ہوس کے سوا انسان کا کچھ مقصد نہیں رہتا۔ اسی لیے اقبال معاشرے کو اس معاشی انارکی سے بچانے کے لیے خودی کا درس دیتے تھے۔ وہ زر یعنی دولت کی اندھی ہوس اور اس کے لیے دوڑ کا خاتمہ چاہتے تھے۔ ۲۷ے

انسانوں کے اندر رزق کمانے کی صلاحیتوں میں فرق ایک بدیہی حقیقت ہے، تاہم ناسور تب شروع ہوتا ہے جب دولت کمانے کی دوڑ اور دولت کی گردش کو روک کر اسے بالائی طبقہ تک محدود کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تو اس طرزِ سے معاشرہ دو حصّوں میں تقسیم ہو جاتا ہے: ایک دولت مند طبقہ اور دوسرا مفلس طبقہ۔ اگر اہل دولت اپنی دولت کو راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں تو اس سے معاشرے میں مساوات پیدا ہوتی ہے اور بہت سی اخلاقی بُرائیاں ناپید ہو جاتی ہیں۔ اس طرز عمل سے کم زور طبقہ کے اندر مضبوط سوچ اُجاگر ہوتی ہے۔ وہ جدوجہد کو اپنا شعارِ زندگی تصور کرتا ہے اور ہوسِ زر میں مبتلا ہونے کے بجائے حق پرست کی زندگی اختیار کرتا ہے۔ ے

اگرچہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات جو فقر سے ہے میسر تونگری سے نہیں ۲۸ے
محروم خودی سے جس دم ہوا فقر تو بھی شہنشاہ میں بھی شہنشاہ ۲۹ے

جب ہم پاک یعنی حلال زر کا نفاذ عمل میں لائیں گے تو زمین کی ملکیت کے اسلامی قانون کو بھی عمل میں لانا ضروری ہے۔ اس وجہ سے ملکیتِ زمین کے شرعی تصور کا ادراک بھی ضروری ہے۔ کیوں کہ سرمایہ دارانہ نظام میں سب سے زیادہ اہمیت نجی ملکیت کو دی جاتی ہے، جب کہ اشتراکیت میں ریاستی ملکیت کا تصور کارفرما ہے۔ ایک تصور انسان کے اندر ہوس وحرص کا مادہ پیدا کرتا ہے تو دوسرا کاہلی کو جنم دیتا ہے۔ اس سے کام کی صلاحیت انسانی طرز پر ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اسلام جس طرز عمل کو اپنانا چاہتا ہے وہ انسانی بقا کے لیے ایک جامع اور صحیح طریقہ ہے۔

متعدد احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ زمین کی ملکیت اُس وقت تک برقرار رہے گی جب تک انسان، جس کے تصرف میں وہ ہے، اُس کو کاشت کے لیے استعمال کرے اور معاشرے کو اُس سے فائدہ ہوتا رہے۔ حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''جس کے پاس زمین ہو وہ یا تو کاشت کرے یا اپنے بھائی کو بِلا معاوضہ دے دے، لیکن اگر وہ نہیں دینا چاہتا تو اپنی زمین روکے رکھے''۔

لیکن دوسری حدیث حضرت ابوسعید الخذریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مزابنۃ اور محاقلۃ سے منع فرمایا ہے۔ مزابنۃ سے مراد درختوں پر کھجوروں کی خریداری اور محاقلۃ سے مراد زمین کا کرایہ ہے۔ (صحیح مسلم)

جہاں تک زمین کی نجی ملکیت کا تعلق ہے، قرآن مجید میں اس کے حق میں ٹھوس شواہد نہیں ملتے ہیں، البتہ شریعت اسلامی اس بات میں پوری واضح ہے کہ جو شخص کسی مردہ زمین کو زندہ کرے وہ اس کی ملکیت ہے۔ اسی طرح اگر کسی نے صحیح طریقے سے زمین خریدی تو یہ بھی اس کی ملکیت ہے، مگر کسی بھی شخص کے لیے زمین کی ملکیت بنیادی طور پر اس بنا پر قرار پائے گی کہ وہ اس میں پیدوار اُگا کر اس سے انتفاع کر رہا ہے، نہ کہ محض اس وجہ سے کہ وہ اس کا مالک ہے۔ اگر غور کیا جائے تو اسے بالکل آزادانہ تصرف حاصل نہیں ہے، بلکہ اسے اسلامی نظام اور اس کے مقررہ اصول وضوابط کا پابند ہونا پڑے گا۔ اس تناظر میں برصغیر کی زمین کی نجی ملکیت کے بارے میں متعدد علماء کرام نے ہندوستان میں فتویٰ صادر کر کے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آراضیٔ ہند اشخاص کی ملکیت نہیں، بلکہ وقف للمسلمین کی حیثیت میں ملکیتِ خداداد ہے۔ اسی زمین کو فقہی اصطلاح میں 'ارض الحوازہ' کہا جاتا ہے۔ اس کے تاریخی شواہد موجود ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ارض عراق کے متعلق ایسا فیصلہ کیا تھا کہ یہ ملکیت وقف للمسلمین ہے اور شیخ جلال الدین تھانیسری نے اپنے رسالہ 'تحقیق آراضیٔ ہند' میں آراضیٔ ہند کو بیت المال کی ملکیت قرار دیا تھا۔ اس کے بعد بہت سے علماء کرام، خاص کر شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے اپنے فتاویٰ میں وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ آراضیٔ ہند بیت المال

کی ملکیت ہے اوراس کی حفاظت کی ذمہ داری ہر مسلمان پر عائد ہوتی ہے ۳۰۔ اس انداز سے دیکھا جائے تو علامہ اقبال اسلاف کی فکر کے امین ہیں، جو زمین کو نجی ملکیت کے بجائے آراضیٔ المملکۃ قرار دیتے ہیں ۔

دہ خدایا! یہ زمین تیری نہیں، تیری نہیں! تیرے آبا نہیں، تیری نہیں میری نہیں ۳۱۔

علامہ اقبال کا مدعا سمجھنے کے لیے ملکیت اور متاع میں فرق کرنا از حد ضروری ہے۔ اگر تصور ملکیت کو اپنی اصل میں دیکھا جائے تو یہ اپنے قبضۂ اختیار میں لینے کے معنیٰ میں ہے اور متاع کے معنیٰ دراصل سامانِ گزر بسر اور پونجی کے ہیں۔ قرآنی تصور کے مطابق متاع درحقیقت زندگی گذارنے کے لیے سامانِ ضرورت ہے۔ ۳۲۔

اس لیے قرآن کے آفاقی اصولوں پر نظر ڈالی جائے تو ملکیت درحقیقت اللہ کی حاکمیتِ کلّی ہے اور انسان کو جو حقِ جائداد عطا کیا گیا وہ اس کے پاس امانت ہے۔ اقبال نے اپنی شہرآفاق کتاب 'جاوید نامہ' کی ایک نظم 'ارض ملکِ خدا است' میں اس تصور کی بہت خوبی سے وضاحت کی ہے۔ ان کے نزدیک اس میں موجود تمام چیزیں اللہ کی عطا کردہ ہیں اور انسان محض تمتع کا حق رکھتا ہے۔ ۔

هم چناں ایں بادوخاک و ابر وکشت باغ وراغ و کاخ وکو وسنگ وخشت
اے کہ می گوئی متاع ماز ماست مردِ ناداں ایں ہمہ ملکِ خدا است
ارض حق را ارض خود دانی بگو چیست شرح آئیہ لا تفسدو!
ابن آدم دل بابلیسی خود نبرد اے خوش آن کو ملک حق با حق سپرد ۳۳۔

سرمایہ دارانہ معیشت کی بنیاد لامحدود نجی ملکیت اور منافع کے حق، کھلی منڈی کے تحت مقابلے اور حکومت کی کم سے کم مداخلت کے اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ یہ نظام ہر قسم کی اخلاقی قدروں سے ماوراء اور جہد للبقا کے اصول پر استوار ہے۔ اقبال کی نظم و نثر دونوں اس امر پر شاہد ہیں کہ انہیں یہ نظامِ فاسد پسند نہیں ہے، کیوں کہ اس سے امیر لوگ غریبوں کو اپنا کو غلام بنا لیتے ہیں۔ اس میں کسی قسم کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ ہر شعبے کے بالادست افراد دیگر لوگوں کا گلا گھونٹتے ہیں۔ جاگیردار دہقان کو اپنا غلام سمجھتا

ہے اور یہ تاثر دیتا ہے کہ وہ اُس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح سرمایہ دار مزدور کو پیستا ہے۔ اس طرز زندگی سے غریب طبقہ مختلف آقاؤں کے درمیان پھنس کر رہ جاتا ہے اور اس کی زندگی کا مقصد محض تن کی خاطر جد و جہد رہ جاتا ہے ۔

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے　　قبض کی روح تیری دے کے تجھے فکرِ معاش ۳۴ ۔

سرمایہ دارانہ نظام جس قسم کے حالات پیدا کرتا ہے، اس کے خد و خال اقبال یوں واضح کرتے ہیں ۔

حکمتِ ارباب لیں مکر است و فن　　مکر و فن؟ تخریب جان تعمیر تن!
حکمتے از بندِ دین آزادۂ　　از مقام شوق دور افتادۂ
مکتب از تدبیر او گیرد نظام　　تا بکامِ خواجہ اندیشہ غلام!
ملتے خاکستر او بے شرر　　صبحِ او از شام او تاریک تر
ہر زماں اندر تلاش ساز و برگ　　کارِ او فکر معاش و ترسِ مرگ ۳۵ ۔

سرمایہ درانہ نظام میں انسان دوسرں کے خوابوں کا خون کرکے بغیر پروا کیے آگے نکل جاتا ہے۔ وہ انسان کے جسم کے ہر قطرۂ زندگی کو چوس کر کے خالی ڈھانچہ چھوڑ دیتا ہے۔ اس نظام کی مثال شہد کی مکھی کی طرح ہے کہ وہ پھول سے اس کا رس چوس لیتی ہے، جس کے نتیجے میں پھول کی شاخ، رنگ، پتے وغیرہ تو رہتے ہیں، لیکن جسم سے روح خالی رہتی ہے۔

۔

ہم ملوکیت بدن را فر ہی است　　سینۂ بے نور او از دل تہی است
مثل زنبو رے کہ برگل می ثرد　　برگ لا بگزارد و شہدش برو
مرگ باطن گر چہ دیدن مشکل است　　گل مخوان او را کہ در معنی گل است ۳۶ ۔

اقبال دنیائے انسانیت کو جدید تثلیث کے استحصالی نظام سے نجات دِلانا چاہتے ہیں۔ اس میں سرمایہ داری، مذہبی پیشوائیت اور اربابِ حکومت شامل حال ہیں۔ وہ سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمے ہی کے نہیں، بلکہ مکمل صورت حال میں تبدیلی کے خواہاں ہیں۔ ۔

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو　　کاخِ امراء کے در و دیوار ہِلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقین سے کنجشک و فرومایہ کو شاہین سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مِٹا دو
کیوں خالق ومخلوق میں حائل رہیں پردے پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو ۳۷؎

اقبال اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے خود کو اشتراکیت کا سہارا لینے پر مجبور پاتے ہیں، مگر اس اشتراکی نظام میں انھیں وہ دم خم نظر نہیں آتا ہے جو انھیں اسلام کے طریقۂ جدوجہد میں دکھائی دیتا ہے۔ اس جدوجہد کا جو نقشہ اقبال نے کھینچا ہے اُس کو رحیم بخش شاہین نے یوں پیش کیا ہے: ''اس شعر میں علم کا مقصد روحانی و اخلاقی معراج کا حصول ہے۔اس شعر میں سرمایہ پرستی ،خودغرضی اور انسانی محنت کا استحصال نہیں ہے۔مزدور سرمایہ دار کے استحصال سے آزاد ہے''

چوں کہ اقبال سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف تھے اور وہ ملوکیت کو سرمایہ داری کی بنیاد قرار دیتے تھے، اس لیے اُس کا ماننا ہے کہ جب تک ملوکیت ختم نہیں ہوگی اس وقت تک دنیا سے غربت کا خاتمہ نہیں ہوسکتا۔ جن لوگوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ علامہ اقبال اشتراکیت کے حامل تھے اور وہ اس کا عملی نفاذ چاہتے تھے، وہ صراحتاً غلط فہمی کا شکار ہیں۔ اقبال 'جاوید نامہ' میں اشتراکیت کے علم برداروں کو بہ ذریعہ افغانی یہ پیغام دیتے ہیں کہ اشتراکیت کی طرح اسلام بھی ملوکیت، قیصریت، کلیسائیت، مذہبی اجارہ داری، سرمایہ داری، جاگیرداری اور زمین داری کے اصولوں کے خلاف ہے۔ اسلام ابتدا سے مساوات کا حامل ہے، جیسے آج اشتراکیت مساوات کا دعویٰ کرتی ہے۔ دونوں مفلسوں، ناداروں اور غریبوں کی کفالت چاہتے ہیں۔ اس مساوات کے بعد جو بات اہمیت کی حامل ہے وہ یہ کہ وہ روسیوں کو خطاب کر کے اُن کو ہمت دِلاتے ہیں کہ اس مساوات کے لیے اگر وہ ایک قدم آگے بڑھیں اور سچے خُدا پر ایمان لے آئیں تو دنیا کو ایک مستحکم نظام فراہم ہوجائے گا۔ اس لیے اگر تم لا اِلٰہ کے بعد اِلاّ اللّٰہ کے قائل نہیں ہو تو کوئی مستحکم نظام نہ دے سکو۔ ؎

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے جُستۂ او را اساسِ محکمے ۳۸؎

اس نظام کے حصول کے لیے اقبال نے روسیوں کو قرآن کریم سے تعلیمات حاصل کرنے کو کہا، کیوں کہ اسلام سود خوری اور سر مایہ داری کے حق میں پیغامِ مرگ ہے۔ اس نے مزدوروں کے حق میں ایک نئی اُمید جگا دی۔ اقبال پر قرآنی تعلیمات کا اتنا زیادہ اثر تھا کہ انھوں نے کھل کر سر مایہ داری اور جاگیر داری کو انسان دوستی، مساوات اور تقویٰ و نیکی کے خلاف قرار دیا۔ ؎

چیست قرآن؟ خواجہ را پیغام مرگ	دستگیر بندۂ بے ساز و برگ
ہیچ خیر از مردکِ زر کش مجو	لَنْ تَنَا لُوْ الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوا ۳۹؎

اقبال کا ماننا ہے کہ کاشت کار زمین داروں کے جبر و ظلم سے محفوظ رہے، سائنسی ترقی کا مقصد انسانیت کی فلاح و بہبود اور مکمل امن و امان ہے۔ ہر شخص کو فکر و عمل کی آزادی حاصل ہے۔ اس شعر میں فرد اور معاشرے کے حقوق و فرائض میں بے مثال ہم آہنگی ہے۔ اخوت و بھائی چارہ معاشرے کی پہچان ہے۔ یہ خصوصیات صرف اور صرف اسلامی بنیادوں پر قائم ہونے والے معاشرے اور معیشت میں ممکن ہیں۔

علامہ اقبال زندگی کو اسلامی نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اگر چہ ہیگل کی طرح ان کا تصورِ زندگی بھی ارتقا پذیر ہے، تاہم ایک بنیادی فرق دونوں کے نقطۂ نظر میں یہ ہے کہ ہیگل تاریخ عالمِ روح مطلق کو نمائش گاہ کے مانند مانتے ہیں۔ اُن کے نزدیک انسانی صلاحتیں، یہاں تک کہ تمام انسان روحِ مطلق کے آلۂ کار رہیں۔ اس کے علاوہ ہیگل کے نزدیک اس کش مکش کا نتیجہ بقائے اصلح ہے۔ اس کے بر عکس اقبال کے نزدیک کش مکش کی اصل بنیاد حق و باطل کی کش مکش ہے۔

اقبال کے نزدیک انقلاب کا بنیادی مقصد انسانوں کو غلامی سے نجات دِلانا ہے، نہ کہ حکم رانوں کی تبدیلی۔ یعنی نظامِ کائنات میں ایک خطہ کو دوسرے خطہ سے تبدیل کرنا۔ ان کا مقصد اللہ کے قانون کی حکم رانی ہے، جس کا نتیجہ حلال و حرام کی حدود کا تعین ہوگا۔ ؎

تا ندانی نکتۂ اکلِ حلال	بر جماعت زیستن گردد وبال ۴۰؎

اس قانون کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان معاشی لحاظ سے کسی کا محتاج نہیں رہے گا۔

کسی نہ گردد در جہاں محتاج کس　　نکتۂ شرح مبین ایں است وبس ۴۱

اخلاقی قدروں سے جب انسان آراستہ ہوگا، جو کہ خُدا کو تسلیم کرنے کا لازمی نتیجہ ہے تو معیشت انفاق فی سبیل اللہ کی بہ دولت مالامال ہوگی۔

جو حرف قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک　　اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار ۴۲

ہندوستانی مسلمانوں کو اُنیسویں صدی کے وسط میں جو معاشی مشکلات درپیش تھیں، وہ آج بھی موجود ہیں۔ علامہ اقبال نے اس حوالے سے جس تدبر و تفکر اور تحقیقی انداز سے اس کی بنیادی وجوہ بیان کیں وہ قابلِ تحسین ہیں۔ وہ معاشی اصلاح کو کلیدی اہمیت دتے تھے۔ اُن کا سو فی صد ایمان تھا کہ جب تک مسلمان معاشی بدحالی سے نجات حاصل نہیں کریں گے، وہ سیاسی تبدیل لانے میں کام یاب نہیں ہو سکیں گے۔ انگریزوں کے سفاک طریقے اور بعد ازاں ہم وطنوں کے من مانی طریقۂ کار نے مسلمانوں کو معاشی بدحالی کے بدترین اندھیرے میں دھکیل دیا ہے۔ اس لیے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ وہ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف ایک جٹ ہو کر، انفاق فی سبیل اللہ کے طرز پر معاشی نظام قائم کرنے کے لیے جدوجہد کریں۔

حواشی و مراجع

۱۔ محمود ابوالسعود؛ اسلامی معیشت کے بنیادی اصول، الاتحاد الاسلامی العالمی للمنظمات الطلابیۃ، کویت، ص: ۱۵-۱۸

۲۔ حوالہ سابق، ۲۰-۲۱

3- M Aziz : An Islamic Perspective of Political Economy: The Views of (late) Muhammad Baqir al-Sadr, al Tawhid Islamic Journal, vol. X, No.1, Qum, Iran, P:6

4- Alfered Marshall, Principles of Economy , Cosmic Ins. USA, 2006 ,V:1,P:10